سلام بن رزاق کا افسانہ ''اندیشہ'' کا تجزیہ

محمد نسیم، ریسرچ اسکالر
حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی
حیدرآباد، تلنگانہ

سلام بن رزاق عصر حاضر کے ایک معتبر افسانہ نگار ہیں ۔انھوں نے اپنے افسانے کا آغاز بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے کیا۔ یہ دور علامتی و تجریدی افسانے کے عروج کا دور تھا۔اس دور میں افسانے سے کہانی اور ادب سے قاری کا رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔سلام بن رزاق نے بھی ابتدا میں تجریدی و علامتی افسانے لکھے لیکن جلد ہی وہ ان بھول بھلیاں کی چہار دیواری سے نکل کر افسانے میں بیانیہ انداز اور کہانی پن کو واپسی دلانے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔

جس طرح سیارے اپنے مدار پر گھومتے ہیں اسی طرح ادب سماج کے گرد چکر لگاتا ہے۔سماجی تبدیلی سے سب سے پہلے متاثر ہونے والی ذات انسان کی ہے اور انسانوں میں تخلیق کار کی ۔سلام بن رزاق نے زیر نظر افسانہ ''اندیشہ'' 2000ء میں تخلیق کیا۔بیسویں صدی کی اس دہائی میں بابری مسجد کو منہدم کیا گیا اور اس انہدام کے بعد ملک کئی شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات برپا کیے گئے ۔اگرچہ افسانہ نگار نے اس افسانے میں کسی فساد کے منظر کو پیش نہیں کیا ہے۔تاہم فسادات کے بعد ملک پر پڑنے والے خطرناک اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

> فسادات تو چند گھنٹوں یا چند دنوں میں ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس کا خوف لوگوں کو خاص طور پر اقلیتی طبقے کو سالوں سال اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے۔انھیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ پھر وہی خون خرابہ دوبارہ نہ عود کر آئے۔اسی ''اندیشہ'' اور سوچ وفکر کی وجہ سے وہ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں

اوراپنے طبقے کے اکثریتی علاقے میں جا کرسکونت اختیار کر
لیتے ہیں۔افسانے کا مرکزی کردارشیخ رضی الدین ایک
سیکولر ذہنیت کا شخص ہے۔وہ اس بات کے خلاف ہے کہ
لوگ اپنے مذہب وملت کے ساتھ ہی رہیں اور دیگر مذاہب
کے لوگوں سے تعلقات منقطع
کرلیں۔لیکن.....اقتباس

''ریٹائرڈمینٹ کے بعد جب نیا مکان لینے کی بات چلی تو
ان کے دونوں بیٹوں نے صاف طور پر کہا تھا۔
پچھلے فسادات میں ہم یہاں لٹتے لٹتے بچے ہیں۔لہٰذا مکان
ایسی جگہ لیا جائے جہاں اپنے لوگ ہوں۔
انھوں نے مخالفت کرنا چاہی تو بیوی نے ڈپٹ دیا۔
بچے صحیح تو کہہ رہے ہیں۔ہماری آپ کی تو جیسی گزرنی تھی
گزرگئی۔
بچوں کے سامنے ان کی پوری زندگی پڑی تھی۔آپ اپنا گھسا
پٹا سیکولرازم اپنے پاس رکھیے۔بچے جیسا کہتے ہیں ویسا ہی
کیجئے''.....

(اقتباس ختم)

بیٹوں کے ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اقلیتی طبقے کی نوجوان نسلیں خود کو دوسرے اکثریتی طبقے میں محفوظ نہیں سمجھ رہی ہیں۔یہ ایک موجودہ نفرت اور عصبیت بھرے معاشرے پر گہرا

طنز ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسان سے خوف زدہ ہے۔ ہر چند کہ بعض معر اشخاص اپنے نوجوان نسلوں کو طبقاتی علٰحدگی کے مضر اثرات سے واقف کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن نوجوان نسل ایک ایسا مستقبل چاہتا ہے جہاں کم از کم اس کی جانیں محفوظ ہوں۔اگر چہ شیخ رضی الدین اپنا پرانا مکان چھوڑ کر کہیں اور منتقل نہیں ہونا چاہتے ہیں مگر بیوی اور بیٹوں کی ضد پر انھیں اپنا آبائی مکان بیچنا پڑا اور مسلم آبادی والے کالونی عظمت نگر میں نیا مکان لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہاں سلام بن رزاق اشارتاً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ دور میں گھر کے بزرگوں کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی جو ماضی میں ہوا کرتی تھی۔

مذکورہ اقتباس کے آخری چند جملوں میں یہ واضح ہے کہ نقل مکانی کے تعلق سے بیوی اپنے شوہر کے موافقت میں نہیں ہے بلکہ بیٹوں کے موافقت میں ہے۔اس حمایت کی وجہ یہ ہے کہ ماں ایک مذہبی قسم کی خاتون ہیں جسے افسانہ نگار نے ''سیدانی'' کہہ کر طنز بھی کیا ہے۔

سلام بن رزاق کا بیوی کو مذہبی خاتون بتلانے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ فرقہ ورانہ ذہنیت کی ہیں لیکن اتنا اشارہ ضرور موجود ہے کہ مذہبی شدت ہمیں غیر مذاہب کی صحبت سے باز رکھتی ہے۔

اپنا مکان چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کر لینے پر ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ سلام بن رزاق اس کہانی اور کرداروں کے ذریعہ قاری کی حوصلہ شکنی کر رہے ہیں۔جب کہ ایسا قطعی نہیں ہے۔افسانہ نگار کا مقصد حوصلہ شکنی بلکہ فسادات سے نفرت پیدا کرنا ہے۔اور نفرت ہی تبدیلی وانقلاب کا پہلا قدم ہے۔

مسلم کالونی عظمت نگر میں منتقلی سے گھر کے سبھی افراد خوش تھے۔لیکن شیخ رضی الدین کو گھبراہٹ ہوتی تھی۔ایسا اس لیے کہ یہاں ان کے اردگرد صرف مسلمان رہتے تھے اور انھیں ہر دن اپنے تر پاٹھی، گپتا، شکلا اور سید بخاری جیسے ہندو مسلم دوستوں کے ساتھ بیٹھک کی عادت تھی ۔شیخ رضی الدین اپنے دوستوں سے ملاقات کے لیے بذریعہ سائیکل 8-10 کلومیٹر کی مسافت

طے کر کے جایا کرتے تھے۔ایک دن جب وہ ملاقات کر کے واپس ہو رہے تھے کہ راستے میں کتوں کے ایک غول نے ان پر چڑھائی کر دی۔.....اقتباس۔

''جھولے کا سارا سامان بکھر گیا تھا۔معاً تعاقب کرتے ہوئے کتے۔غراتے اور دانت نکوستے بکھرے ہوئے سامان پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں ساری چیزوں کو بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔پان،سپاری،امرتیاں،ٹافیاں ،مولی،گاجر،انجیر سب مٹی دھول میں مل چکے تھے۔پپو کی میجک سلیٹ ایک طرف چمک رہی تھی اور بھارت کے نقشے کا چارٹ پرزہ پرزہ ہوا میں بکھر چکا تھا۔شیخ رضی الدین اپنے زخمی گھٹنوں کو سکوڑے خوف زدہ نگاہوں سے اس وحشت ناک منظر کو دیکھ رہے تھے۔چند لمحوں میں ایک ایک چیز کو تہس نہس کرنے کے بعد وہ سارے کتے آس پاس کی گنجان جھاڑیوں کے درمیان پھیلے اندھیرے میں یوں غائب ہو گئے گویا وہ اسی اندھیرے کا حصہ رہے ہوں۔''

(اقتباس ختم)

اس اقتباس میں سلام بن رزاق نے استعاروں کے ذریعہ کئی نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔کتوں کا جھپٹنا دراصل فرقہ پرست طاقتوں کا حملہ ہے۔اور شیخ رضی الدین کا زخمی ہونا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات ایسے لوگوں کو بھی اپنی زد کی حصار میں لے لیتے ہیں جو کہ مذہب وملت کی تفریق سے بے نیاز ہوتے ہیں،جس کے دل میں ہر مذہب کے لیے

یکساں عزت واحترام ہوتا ہے، جو ملک کی سالمیت مشترکہ تہذیب میں سمجھتا ہے۔ یہ فکر اور سوچ صرف مرکزی کردار شیخ رضی الدین کی نہیں ہے بلکہ یہ نام علامت کے طور پر ان تمام لوگوں پر محیط ہے جو کسی انسان کو مذہب کا عینک لگا کر نہیں دیکھتے بلکہ بحیثیت انسان اور مخلوق کے دیکھتے ہیں۔

اسی اقتباس میں راوی کا یہ کہنا کہ ''بھارت کے نقشے کا چارٹ پرزہ پرزہ ہوا میں بکھر چکا تھا'' یہ پورا جملہ استعاراتی رنگ میں ہے جس سے مراد یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات نے ملک کے آپسی اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کو نیست و نابود کر دیا ہے اور دوسرا اشارہ اس کی طرف ہے کہ اگر ہم اسی طرح ایک دوسرے کے خوف سے اپنے اپنے ہم مذاہب کی الگ الگ بستیاں بسالیں گے تو ملک کئی حصوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔

مذکورہ اقتباس کے آخری جملے میں یہ بات مضمر ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں اجتماعی صورت میں حملہ آور ہوتی ہیں پھر حملے کے بعد اس طرح غائب ہو جاتی ہیں کہ ان کی نشاندہی محال ہو جاتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انھیں سیاست داں و حکمرانوں کی پست پناہی حاصل ہوتی ہے۔ سلام بن رزاق اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے سیاست داں اپنی سیاسی بالا دستی کے لئے فسادات کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور فریقین کے مابین نفرت کی دیوار کھڑی کر کے اپنی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

بظاہر یہ ایک سادہ افسانہ ہے جو کسی پیچیدگی اور ابہام کے بغیر انجام تک پہنچتا ہے۔ افسانہ نگار نے کہیں کہیں رمزیہ عناصر یعنی علامتوں واستعاروں کو بھی شامل کیا ہے لیکن استعارے وہ نہیں ہیں جس کی وجہ سے جدیدیت کے افسانے چیستاں بن گئے تھے۔ ان استعاروں کے معنیاتی انسلاکات سے پردہ اٹھانے میں قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ان استعاروں نے کہانی کو زیادہ موثر اور کسی حد تک تہہ دار بنا دیا ہے۔

☆☆☆